تفہیم القرآن

سُورۃ الاعراف تا سُورۃ بنی اسرائیل

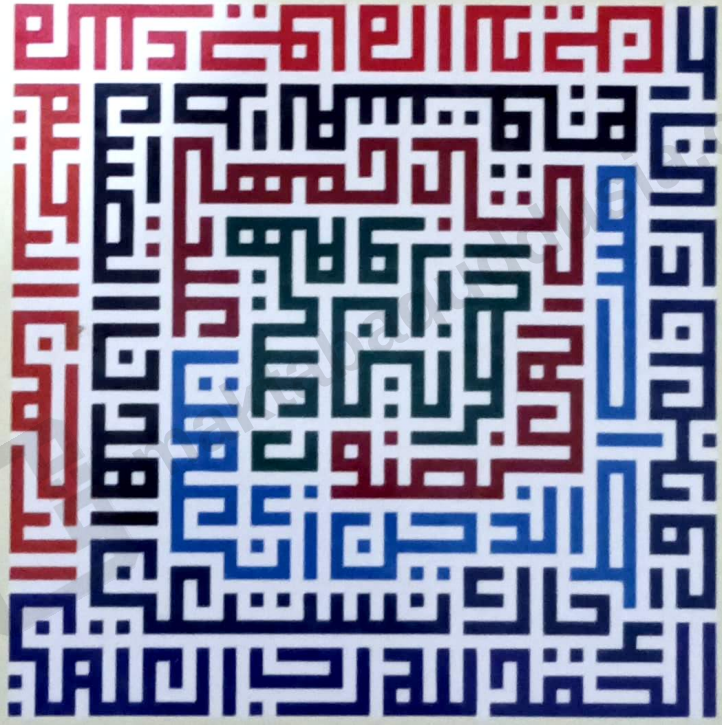

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد دوم

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ



maktabah.org
maktabahmalaysia.com

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

تفہیم القرآن

سُورۃ الاعراف تا بنی اسرائیل

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ

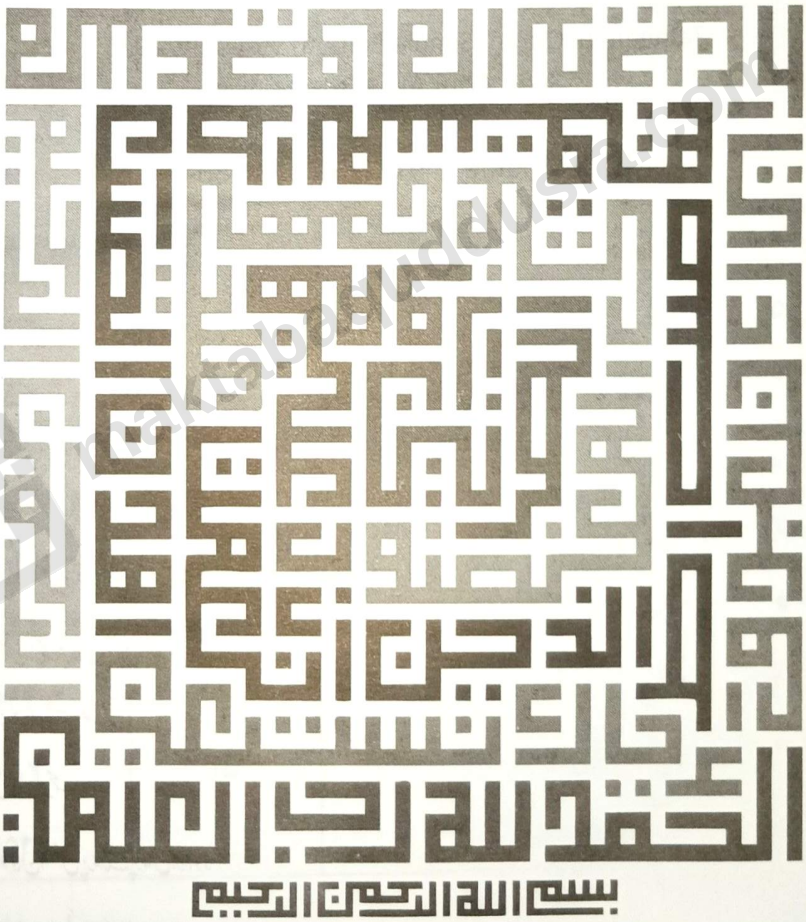

۲

ادارہ ترجمان القرآن
IDARA TARJUMAN-UL-QURAN

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	الاعراف	۷	۵
۲	الانفال	۸	۱۱۸
۳	التوبہ	۹	۱۶۶
۴	یونس	۱۰	۲۵۸
۵	ہود	۱۱	۳۲۰
۶	یوسف	۱۲	۳۷۸
۷	الرعد	۱۳	۴۴۰
۸	ابراہیم	۱۴	۴۶۸
۹	الحجر	۱۵	۴۹۶
۱۰	النحل	۱۶	۵۲۲
۱۱	بنی اسرائیل	۱۷	۵۸۶
۱۲	فہرست موضوعات		۶۵۳

maktabaquddusia.com

فہرست نقشہ جات

(تمام نقشہ جات جلد کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	ان قوموں کے علاقے جن کا ذکر سورۂ اعراف میں آیا ہے	۵۸
۲	خروج بنی اسرائیل ..... سُورۂ اعراف	۷۶
۳	قریش کی تجارتی شاہراہ ..... الانفال	۱۲۲
۴	مدینہ سے بدر تک ..... الانفال	۱۲۴
۵	جنگ بدر ..... الانفال	۱۲۶
۶	غزوۂ تبوک کے زمانہ کا عرب ..... توبہ	۱۶۸
۷	قوم نوح کا علاقہ اور جبل جودی ..... ہود	۳۴۰
۸	نقشہ قصہ یوسف علیہ السلام ..... یوسف	۳۸۲
۹	فلسطین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ..... بنی اسرائیل	۵۹۶
۱۰	حضرت داود وسلیمان علیہما السلام کی سلطنت ۱۰۰۰-۹۳۰ ق-م	۵۹۸
۱۱	بنی اسرائیل کی دو ریاستیں ''یہودیہ'' اور ''اسرائیل'' ۸۶۰ ق-م	۵۹۹
۱۲	فلسطین بزمانۂ دولت مکابیہ ۱۶۸-۶۳ قبل مسیح	۶۰۰
۱۳	ہیرود اعظم کی سلطنت ۴۰-۴ قبل مسیح	۶۰۱
۱۴	فلسطین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں	۶۰۲

maktabaqudduslia.com

الاعراف

نام اس سورہ کا نام اَعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی آیات ۴۶-۴۸ میں اَعراف اور اصحابِ اَعراف کا ذکر آیا ہے۔ گویا اسے ''سورۂ اعراف'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ''سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے۔''

زمانۂ نزول اِس کے مضامین پر غور کرنے سے بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول تقریباً وہی ہے جو سورۂ اَنعام کا ہے۔ یہ بات تو یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہے یا وہ۔ مگر اندازِ تقریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ہے یہ اُسی دَور سے متعلق۔ لہٰذا اس کے تاریخی پَس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیباچے پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا جو ہم نے سورۂ اَنعام پر لکھا ہے۔

مَباحِث اس سورہ کی تقریر کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدّعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطَب ہیں (یعنی اہلِ مکہ) انھیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور اُن کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عنقریب پیغمبر کو اُن سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رُجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قُبولِ رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو رَوِش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلے میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی رَوِش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلے میں اختیار کر کے بہت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان پر حُجّت تمام ہونے کے قریب آ گئی ہے، اس لیے تقریر کے آخری حصّے میں دعوت کا رُخ اُن سے ہٹ کر اہلِ کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دَور جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہُوا کرتا ہے، خاتمے پر آ لگا ہے۔

دورانِ تقریر میں چونکہ خطاب کا رُخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے، اس لیے ساتھ ساتھ دعوتِ رسالت کے اِس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اُس کے ساتھ منافقانہ رَوِش اختیار کرنے، اور سمع و طاعت کا عہد اُستوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مُستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو حکمتِ تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ انھیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور چیرہ دستیوں کے مقابلے میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

۲۰۶ اٰیاتھا ۲۴ رکوعاتھا

سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓصٓ ① کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ②

الٓمّٓصٓ[1] یہ ایک کتاب ہے جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے[1]، پس اے محمدؐ! تمھارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو[2]۔ اس کے اُتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دہانی ہو۔[3]

۱- کتاب سے مراد یہی سورۂ اعراف ہے۔

۲- یعنی بغیر کسی جھجک اور خوف کے اِسے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرو کہ مخالفین اس کا کیسا استقبال کریں گے۔ وہ بگڑتے ہیں، بگڑیں۔ مذاق اُڑاتے ہیں، اُڑائیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بنائیں۔ دشمنی میں اور زیادہ سخت ہوتے ہیں، ہو جائیں۔ تم بے کھٹکے اس پیغام کو پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ میں ذرا باک نہ کرو۔

جس مفہوم کے لیے ہم نے لفظ جھجک استعمال کیا ہے، اصل عبارت میں اس کے لیے لفظ حَرَجٌ استعمال ہوا ہے۔ لُغت میں حَرَج اُس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہُوا کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رُکے۔ اسی مضمون کو قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ضِیقِ صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ (الحجر، آیت ۹۷) ”اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو۔“ یعنی تمھیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی اور مخالفتِ حق کا یہ حال ہے، انھیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (ہود، آیت ۱۲) ”تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمھاری دعوت کے جواب میں کہیں گے: اِس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُترا، یا اِس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔“

۳- مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کا اصل مقصد تو ہے اِنذار، یعنی لوگوں کو رسول کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتائج سے ڈرانا اور غافلوں کو چونکانا اور مُتنبّہ کرنا، رہی اہلِ ایمان کی تذکیر (یاد دہانی) تو وہ ایک ضمنی فائدہ ہے جو اِنذار کے سلسلے میں خود بخود

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ
اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا
فَجَاۗءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْهُمْ قَاۗىِٕلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ
جَاۗءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

لوگو! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اُس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو[۴] ـــــ مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔

کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا، یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب اُن پر آ گیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔[۵]

حاصل ہو جاتا ہے۔

۴ – یہ اِس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ اصل دعوت جو اس خطبے میں دی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ انسان کو دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم اُسے درکار ہے، اور اپنے اَخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدّن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اُصولوں کا وہ محتاج ہے، ان سب کے لیے اُسے صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اُسی ہدایت کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رُجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریقِ کار ہے، جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

یہاں ''اَوْلِیَآءَ'' (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہُوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے، اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے، خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، خواہ اس کی سرپرستی کا معترف ہو یا بشدت اس سے انکار کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الشُّوریٰ، حاشیہ ۶)

۵ – یعنی تمھاری عبرت کے لیے اُن قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے منحرف ہو کر انسانوں اور شیطانوں کی رہنمائی پر چلیں اور آخرکار اس قدر بگڑیں کہ زمین پر ان کا وجود ایک ناقابلِ برداشت لعنت بن گیا اور خدا کے عذاب نے آ کر اُن کی

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۶﴾

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم اُن لوگوں سے باز پُرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں، اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ اُنھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)۔

نجاست سے دُنیا کو پاک کر دیا۔

آخری فقرے سے مقصود دو باتوں پر مُتنبّہ کرنا ہے: ایک یہ کہ تلافی کا وقت گزر جانے کے بعد کسی کا ہوش میں آنا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا بے کار ہے۔ سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیانِ حق کی صداؤں کو بہرے کانوں سے سُنے جائے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں، بے شمار مثالیں تمھارے سامنے گزر چکی ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو چکتا ہے اور وہ اپنی مہلت کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک اسے آ پکڑتی ہے، اور ایک مرتبہ پکڑ میں آ جانے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل اُسے نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران میں ایک دو دفعہ نہیں، سیکڑوں اور ہزاروں مرتبہ یہی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضرور ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے، اور ہوش میں آنے کے لیے اُسی آخری ساعت کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت واندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔

۶ - باز پُرس سے مراد روزِ قیامت کی باز پُرس ہے۔ بدکار افراد اور قوموں پر دُنیا میں جو عذاب آتا ہے، وہ دراصل ان کے اعمال کی باز پُرس نہیں ہے اور نہ وہ ان کے جرائم کی پوری سزا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تو بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مجرم جو چھوٹا پھر رہا تھا، اچانک گرفتار کر لیا جائے اور مزید ظلم وفساد کے مواقع اس سے چھین لیے جائیں۔ تاریخِ انسانی اس قسم کی گرفتاریوں کی بے شمار نظیروں سے بھری پڑی ہے، اور یہ نظیریں اس بات کی ایک صریح علامت ہیں کہ انسان کو دنیا میں شُتُرِ بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیا گیا ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اُوپر کوئی طاقت ہے جو ایک حدِ خاص تک اسے ڈھیل دیتی ہے، تنبیہات پر تنبیہات بھیجتی ہے کہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائے، اور جب وہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اسے اچانک پکڑ لیتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس تاریخی تجربے پر غور کرے تو بآسانی یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ جو فرماں روا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اس نے ضرور ایسا ایک وقت مقرر کیا ہوگا جب اِن سارے مجرموں پر عدالت قائم ہوگی اور ان سے ان کے اعمال کی باز پُرس کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُوپر کی آیت کو، جس میں دنیوی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، بعد والی آیت کے ساتھ لفظِ ''پس'' کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، گویا اس دنیوی عذاب کا بار بار واقع ہونا آخرت کی باز پرس کے یقیناً واقع ہونے پر ایک دلیل ہے۔

۷ - اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی باز پُرس سراسر رسالت ہی کی بنیاد پر ہوگی۔ ایک طرف پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نوعِ انسانی تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا۔ دوسری طرف جن لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچا، ان سے سوال کیا جائے گا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک انبیاؑ کا پیغام نہ پہنچا ہو، ان کے

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝٧ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٨ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور وزن اُس روز عین حق[۸] ہوگا۔ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں[۹] گے، کیونکہ وہ ہماری

بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مُقدّمے کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ لیکن جن اشخاص و اقوام تک پیغمبروںؑ کی تعلیم پہنچ چکی ہے، ان کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اپنے کفر و انکار اور فسق و نافرمانی کے لیے کوئی حُجّت نہ پیش کر سکیں گے، اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ حسرت و ندامت کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے جہنّم کی راہ لیں۔

۸ – اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز خدا کی میزانِ عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنٰی ہوں گے۔ حق کے سوا کوئی چیز وہاں وزنی نہ ہوگی، اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہوگی۔ جس کے ساتھ جتنا حق ہوگا، اتنا ہی وہ باوزن ہوگا۔ اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا، کسی دوسری چیز کا ذرّہ برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی، خواہ دنیا میں کتنی ہی طویل و عریض رہی ہو اور کتنے ہی بظاہر شان دار کارنامے اس کی پشت پر ہوں، اس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائے گی۔ باطل پرست جب اُس میزان میں تولے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دُنیا میں جو کچھ وہ مدّت العمر کرتے رہے وہ سب ایک پرِکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ کہف، آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵ میں فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ دُنیا کی زندگی میں سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتے رہے اور اللہ کی آیات سے انکار کر کے جن لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کام کیا کہ انجامِ کار کوئی آخرت نہیں ہے اور کسی کو حساب دینا نہیں ہے، ان کے کارنامۂ زندگی کو ہم آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے۔

۹ – اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ انسان کا کارنامۂ زندگی دو پہلوؤں میں تقسیم ہوگا: ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی پہلو۔ مثبت پہلو میں صرف حق کو جاننا اور ماننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہوگا، اور آخرت میں اگر کوئی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی تو وہ بس یہی ہوگی۔ بخلاف اس کے، حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہشِ نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے غیرِ حق کی راہ میں کرتا ہے، وہ سب منفی پہلو میں جگہ پائے گا، اور صرف یہی نہیں کہ یہ منفی پہلو بجائے خود بے قدر ہوگا، بلکہ یہ آدمی کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دے گا۔

پس آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے کارنامۂ زندگی کا مثبت پہلو اس کے

مدینہ سے بدر تک

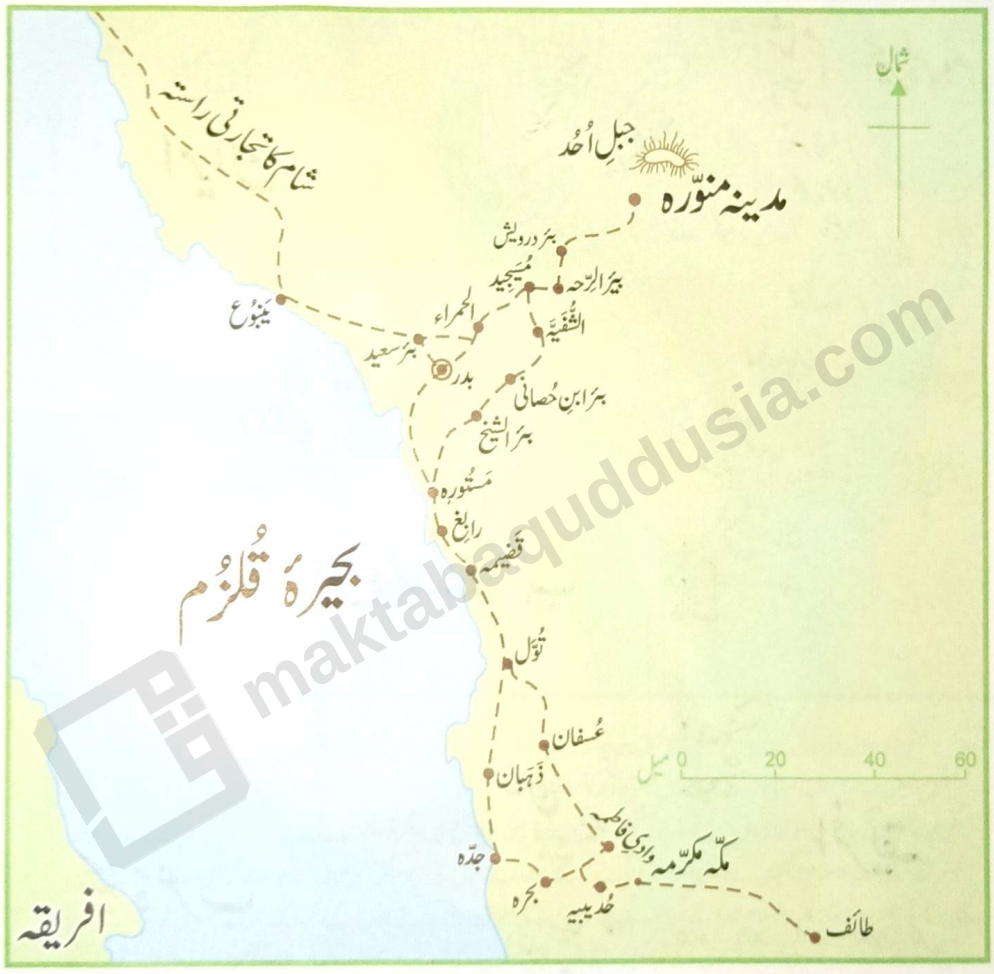

اس نقشے میں قافلوں کے وہ راستے دکھائے گئے ہیں جو مکے سے بدر ہوتے ہوئے شام کی طرف جاتے ہیں۔ نیز وہ راستہ بھی دکھایا گیا ہے جو مدینے سے بدر کی طرف آتا ہے۔

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۲۴ (جلد دوم)

maktabaqudusia.com

نقشہ خروجِ بنی اسرائیل



تشریح: جُشَن کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آباد کیا تھا۔

ممفِس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر کا دار السلطنت تھا۔

بُحَیراتِ مُرّہ، تلخ پانی کی وہ کھاڑیاں ہیں جو آج تو خلیجِ سویس سے فاصلے پر واقع ہیں، مگر قدیم زمانے میں سمندر کا پانی ان سے جا ملتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام رَعمسیس سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اور راستے میں بنی اسرائیل ہر طرف سے سمٹ کر اُن سے آ کر ملتے چلے گئے۔ غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام صحرا کے صاف راستے سے سینا کی طرف جانا چاہتے ہوں گے، مگر ایک طرف مصر کی فوجی چھاؤنیوں سے بچنے کی کوشش اور دوسری طرف فرعون کے تعاقب نے ان کو بَعلِ صَفُون کے قریب لا پہنچایا۔ یہاں غالباً اُنھوں نے بُحَیراتِ مُرّہ کو کسی مقام سے عبور کیا اور یہیں فرعون غرق ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل مارہ، ایلیم، اَلمرخہ اور فارانِ رَفیدیم کے راستے اُس مقام تک پہنچے، جسے آج کل جبلِ موسیٰ کہتے ہیں اور جس کا قدیم نام سینا ہے۔ اِسی کا نام طُور بھی ہے اور اِسی کی وادی کو ''وادیِ مُقدّس طُوٰی'' کہا گیا ہے۔

حمامِ فرعون وہ جگہ ہے جس کے متعلق آج تک جزیرۂ نُمائے سینا کے لوگوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ اِسی جگہ فرعون کی لاش پانی میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔

طُور کے نام سے آج کل جو بندرگاہ جزیرۂ نُمائے سینا میں پائی جاتی ہے، اُس سے مراد کوہِ طور نہیں ہے، بلکہ یہ طور کی بندرگاہ ہے۔

اَلمرخہ اُس علاقے کے سرے پر ہے جس کا نام بائبل میں ''بیابانِ سین'' لکھا ہے۔ یہیں سے مَنّ و سلویٰ کا نزول شروع ہوا۔

رَفیدیم کے قریب حورِب کی وہ مشہور چٹان واقع ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تھا اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔

دَشتِ تِیہ وہ علاقہ ہے جس میں بنی اسرائیل چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔ تِیہ کے معنی بھٹکنے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی آیت فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (المائدہ: ۲۶) سے ماخوذ ہے۔

عَقَبہ یا اَیلہ جس کا قدیم نام عِصیُون جابر تھا، وہ مقام ہے جہاں عام روایات کے مطابق اصحاب السبت کا مشہور واقعہ پیش آیا۔